© rasailojaraid.com

ظفر احمد صدیقی

شبلی کی تاریخ نگاری

جناب ظفر احمد صدیقی نے ادھر کئی سال پہلے مرحوم مولانا شبلی کے علمی کارناموں پر ایک مسودہ ہمیں بھیجا تھا، جو بہ وجوہ شائع نہ ہو سکا۔ اس مسودے کا ایک باب 'علامہ شبلی کی تاریخ نگاری' المعارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے قارئین کرام اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ [رشید احمد]

یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ شبلی کو اپنی تاریخی تصانیف و مقالات کے ذریعے ہی ہند و بیرونِ ہند کے علمی و تحقیقی حلقوں میں روشناس ہونے اور شہرت و ناموری حاصل کرنے کا بہترین موقع ملا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اُنھوں نے اپنی عمر کا طویل ترین اور بہترین حصہ تاریخ خوانی اور تاریخ نویسی میں گزارا، چنانچہ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مہدی افادی کا یہ تجزیہ غلط نہیں کہ 'شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے'[1]۔ شاید اسی لیے خود شبلی بھی اپنے آپ کو مؤرخ ثابت کرنے میں روحانی سکون محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ 'علم الکلام' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے ابتدائے تصنیف سے اپنی تصانیف کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، وہ تاریخی تھیں۔ اس بنا پر علم کلام میرے دائرے سے خارج تھا۔ علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف تو اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے۔ دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہے، تاریخ کے دائرے میں آ جاتی ہے اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔''[2]

اس گفتگو کے بعد ہمیں 'شبلی اور تاریخ' کے ارتباط پر مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت

[1] مہدی افادی: افادات مہدی، ص ۲۲۳۔ [2] شبلی نعمانی: دیباچہ، علم الکلام، ص ۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں رہ جاتی۔ البتہ اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ شبلی میں تاریخ کا ذوق کب اور کیونکر پیدا ہوا؟ سیّد سلیمان ندوی کا قیاس ہے کہ اس ذوق کا بیج غالباً لاہور میں ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب ''سنین اسلام'' کے مطالعے سے پڑا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف 'اورینٹل کالج لاہور' کے بانی اور پرنسپل تھے۔ انھوں نے عربی کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں مرتب کی تھی۔ اس کی تالیف میں شبلی کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی مدد بھی شامل تھی۔ اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ شبلی کو یہ کتاب قیامِ لاہور کے دوران میں ہاتھ آئی ہو[۳]۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' اور ''یادگارِ شبلی'' میں سیّد سلیمان ندوی کے اس خیال کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ شبلی نامہ میں لکھتے ہیں:

> ''واقع یہ ہے کہ (سیّد) سلیمان صاحب کے پاس، اس خیال کی تائید میں ایک بھی شہادت نہیں۔ ان کا سارا اندراج قیاس پر مبنی ہے اور وہ بھی قیاسِ بے جا پر[۴]۔''

اسی طرح یادگارِ شبلی میں رقم طراز ہیں:

> ''اس امر کا کوئی قطعی ثبوت نہیں کہ 'سنین الاسلام' لاہور میں یا علی گڑھ آنے سے پہلے ان کی نظر سے گزری تھی[۵]۔''

ہمارے خیال کے مطابق مسئلہ زیرِ بحث میں شیخ محمد اکرام کی رائے زیادہ صائب اور ان کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔ لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ کتابِ مذکور لاہور میں یا علی گڑھ آنے سے پہلے شبلی کی نظر سے گزر چکی تھی، جب بھی اس سے سیّد سلیمان ندوی کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ کسی فن کی کسی ایک کتاب کا نظر سے گزرنا، اس فن کا مذاق پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ دوسرے شواہد و قرائن کے ذریعے اس کی تصدیق بھی نہ ہوتی ہو۔

---

۳ سیّد سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۱۳۵-۱۳۶۔
۴ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، لکھنؤ، مکتبۂ اُردو، سنہ ندارد، ص ۵۔
۵ شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی، ص ۱۶۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبلی نے لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی صحبت میں رہ کر عربی ادب اور خصوصاً شعرائے جاہلیت کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ چنانچہ وہاں سے واپسی کے بعد اور علی گڑھ جانے سے پہلے ادبِ عربی کا مطالعہ اور ''حماسہ'' کی تدریس کو بھی انھوں نے اپنی مصروفیات کا ایک جزو بنائے رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے 'حماسہ' کو حفظ کر ڈالا اور تمام عمر صبح کے وقت اس کے اشعار گنگناتے رہے۔ کیا اس قسم کی کوئی مثال علی گڑھ جانے سے پہلے کی مدت میں ان کے تاریخی ذوق کے سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہے، تو ماننا پڑے گا کہ قیامِ لاہور کے دوران میں 'سنین الاسلام' کا مطالعہ (بہ شرطیکہ یہ کتاب شبلی کی نظر سے گزری ہو) ان میں تاریخی ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں ناکام ثابت ہوا۔

درحقیقت شبلی میں تاریخ کا ذوق علی گڑھ پہنچ کر پیدا ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس کے محرکات اور اسباب کیا تھے؟ تو اس کے جواب میں تفصیل و تحقیق بلکہ کسی قدر تدقیق کی ضرورت ہے۔ شیخ محمد اکرام نے اس سلسلے میں دو چیزوں کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ ایک تو سرسیّد کا بیش قیمت کتب خانہ اور دوسرے ان کی علمی راہ نمائی۔ جہاں تک اوّل الذکر محرک کا تعلق ہے، اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ سرسیّد کے کتب خانے سے استفادے کے سلسلے میں خود شبلی کے متعدد بیانات موجود ہیں۔ ۱۹؍ستمبر ۱۸۸۳ء کے ایک مکتوب میں مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

> ''میں جس حالت میں ہوں، اچھا ہوں۔ سیّد صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سیّد صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں، مَیں کیا بڑے بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سیّد صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے۔[۶]"

اسی طرح جنوری ۱۹۱۱ء کے ایک مکتوب میں 'زمانہ' کان پور کے ایڈیٹر کو لکھتے ہیں:

> "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصانیف سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں۔ اور ایک موقع پر مجھ کو بہت یک جا ملی تھیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔[۷]"

یہاں تک شبلی کے ذوقِ تاریخی کے محرکِ اوّل کا بیان تھا۔ اب دوسرے محرک یعنی سرسیّد کی جانب شبلی کی علمی راہ نمائی کی بحث کو لیجیے۔ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ سرسیّد نے اپنے کتب خانے سے استفادے کی سہولتوں کے علاوہ بہ طورِ خاص علمِ تاریخ و سیرت نگاری کی جانب انھیں متوجہ بھی کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "سرسیّد کے ہاں فقط شبلی کو وہ کتابیں ہی پڑھنے کو نہ ملیں، جن کا شبلی نے ابھی تک نام نہ سنا تھا۔ بلکہ سرسیّد نے شبلی کی اس علم کی طرف راہ نمائی کی، جو آج ان کا تاجِ فضیلت ہے، یعنی علمِ تاریخ و سیرت نگاری۔[۸]"

لیکن ہمارے خیال کے مطابق شیخ محمد اکرام، سیّد سلیمان ندوی کی ضد اور مخالفت میں آ کر اس مسئلے پر افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور جس طرح اوّل الذکر اپنے انتہاپسندانہ موقف کی بنا پر غلطی پر تھے، اسی طرح ثانی الذکر کا موقف بھی غلط ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے دلائل درج ذیل ہیں:

(الف) حیاتِ جاوید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی (۱۸۸۳ء) میں علی گڑھ پہنچے، ان دنوں سرسیّد اصلاحِ قوم، اشاعتِ تعلیم جدید اور مذہب اسلام کو قانونِ فطرت کے مطابق

---

۶ سیّد سلیمان ندوی: مکاتیب شبلی، حصہ اوّل، ص ۵۶-۵۷۔

۷ ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۳۵۔

۸ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۸۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان تینوں امور میں شبلی سرسیّد سے پوری طرح مستفید اور متاثر ہوئے۔ لیکن جہاں تک تاریخ نگاری کا تعلق ہے، ۶۴-۱۸۶۳ء میں ''تزکِ جہانگیری'' کو ایڈیٹ کرنے کے بعد سرسیّد اس میدان سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کا تاریخ کی جانب شبلی کو متوجہ کرنا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

(ب) سرسیّد کی مصنفہ یا مرتبہ تمام تاریخی کتابیں، مثلاً آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)، آئینِ اکبری (۱۸۵۵ء)، تاریخِ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء) اور تزکِ جہانگیری (۶۴-۱۸۶۳ء) وغیرہ ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہیں اور جہاں تک دنیائے اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے، تو سرسیّد نے اس موضوع پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اس کے برعکس شبلی نے ابتدا ہی سے ہندوستان کے بجائے دنیائے اسلام کی تاریخ کو اپنا اصل موضوع قرار دیا۔ تاریخِ ہند کی طرف اوّل تو وہ ۱۹۰۶ء سے پہلے متوجہ نہیں ہوئے، اور اگر کچھ لکھا بھی ہے تو بہ قول ضیاء الحسن فاروقی وہ ''محدود اور سرسری''[۹] ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگر شبلی کی تاریخ کی طرف متوجہ ہونے میں سرسیّد کی تشویق و ترغیب کا کوئی دخل ہوتا تو یا تو شبلی صرف اسلامی ہند کے مؤرخ ہوتے اور یا ہندوستان کی تاریخ کے بعد انھوں نے دنیائے اسلام کی تاریخ کی طرف توجہ کی ہوتی۔ لیکن ان دونوں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ لہٰذا یہ خیال بھی غلط ہے کہ شبلی سرسیّد کے مشورے سے تاریخ کی جانب متوجہ ہوئے۔

(ج) شبلی نے ۱۹ر ستمبر ۱۸۸۳ء کے جس مکتوب میں سرسیّد کے کتب خانے سے استفادے کا ذکر کیا ہے، وہاں ان کے الفاظ یہ ہیں:

''سیّد صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے[۱۰]۔''

اس جملے میں ''اجازت'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ استفادے کی خواہش کا اظہار شبلی کی جانب سے ہوا، اور سرسیّد نے اس کا احترام کرتے ہوئے، انہیں مستفیض ہونے کا موقع بخشا۔ ورنہ جملہ کچھ اس قسم

۹ ضیاء الحسن فاروقی علامہ شبلی مورخ کی حیثیت سے، اشخاص و افکار، طبع اوّل، دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۳ء، ص ۶۹۔
۱۰ سیّد سلیمان ندوی: مرتبہ، مکاتیب شبلی، حصہ اوّل، ص ۵۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ہوتا:

''سیّد صاحب نے اپنے کتب خانے سے مستفید ہونے کا مجھے مشورہ دیا ہے۔''

اس ضمن میں شبلی کا وہ بیان بھی قابلِ ذکر ہے، جس کی روایت سیّد سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''فرماتے تھے کہ سرسیّد نے مجھے اپنے کتب خانے کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماری کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا۔ کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔ سرسیّد نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی۔''[11]

متذکرہ بالا حقائق کی موجودگی میں عبدالرزاق کانپوری، عبدالحلیم شرر اور حبیب الرحمٰن خان شروانی وغیرہ کے بعض مبہم بیانات کی بنیاد پر شیخ محمد اکرام کا یہ دعویٰ کہ شبلی کو تاریخ اور سیرت نگاری کی جانب سرسید نے متوجہ کیا، نا قابلِ قبول ہے۔

اس مسئلے کی اصل حقیقت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ مولانا کو مطالعۂ کتب کا شوق ابتدا ہی سے رہا۔ یہاں تک کہ وکالت، قرق امینی اور نیل کے گوداموں کی دیکھ بھال جیسی غیر علمی مصروفیتوں کے زمانے میں بھی ان کا یہ شوق انھیں بے چین رکھتا تھا۔ اس لیے ناممکن تھا کہ علی گڑھ پہنچنے اور منصبِ تدریس پر فائز ہونے کے بعد یہ شوق مردہ ہو جاتا۔ چنانچہ اُنھوں نے علی گڑھ پہنچتے ہی ایک صاحبِ ذوق سے دوستی کر لی اور اس سے کتابیں لے لے کر پڑھنے لگے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ وہ شہر میں قیام پذیر تھے اور انھیں سرسیّد کے قریب آنے کا ابھی موقع نہیں ملا تھا۔ چنانچہ ۲۸/اپریل ۱۸۸۳ء کے ایک مکتوب میں مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

> یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری میں ہیں۔ یہ صاحبِ دیوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق۔ بہت سا حصہ ان کی تنخواہ (کا) کتابوں میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں، جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو۔ میں نے ان کو

---

[11] سیّد سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۱۳۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں۔ یہ خوب آدمی ہیں۔ ان کے ذریعے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں۔ یہ بے چارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سلمان ساوجی و طالب آملی دیکھنے کو مل جائے۔ خیر اچھی گذرتی ہے۔[۱۲]''

غالباً شبلی نے اسی دوران سرسیّد سے راہ و رسم بڑھنے کے بعد ان کے کتب خانے سے استفادے کی خواہش ظاہر کی اور سرسیّد نے ان کی درخواست اور خواہش کے پیشِ نظر انھیں کتب خانے سے مستفید ہونے کی اجازت دے دی۔ چونکہ شبلی کو اس وقت تک تاریخی کتابوں کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ تر شعر و ادب کی کتابوں سے سروکار رکھتے تھے۔ اب جب کہ عربی تاریخ و جغرافیہ کی بہت سی نادر و نایاب کتابیں اور وہ بھی اکٹھا طور پر ان کے سامنے آئیں تو انھوں نے شوق اور رغبت سے ان کا مطالعہ کیا اور یہی مطالعہ ان میں تاریخی ذوق پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ اب ہم شبلی کی مورخانہ حیثیت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

مہدی افادی نے شبلی کو ''ملک میں تاریخ کا معلّمِ اوّل'' کہا ہے۔ ہمارے خیال میں شبلی کی مورخانہ حیثیت کے بارے میں یہ ایک نہایت جامع اور معنی خیز تبصرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح حالی اُردو میں جدید سوانح نگاری کے بانی ہیں، اسی طرح شبلی کو اُردو میں جدید طرز کی تاریخ نگاری کی روایت قائم کرنے کا شرف حاصل ہے اور اس لحاظ سے وہ یقیناً ملک میں تاریخ کے معلّمِ اوّل کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اگر سرسیّد کی ''آثار الصنادید'' کو مستثنیٰ قرار دیا جائے تو شبلی کے عہد تک اُردو نثر و نظم کی تاریخ میں خالص تاریخ نگاری کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دکن کی بعض نیم سوانحی و نیم افسانوی مثنویاں یا شعرائے اُردو کے تذکرے ہمارے دائرۂ بحث سے اس لیے خارج ہیں کہ وہ خالص

۱۲ سیّد سلیمان ندوی: مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، ص ۵۴۔ یہ خط ۲۸ اپریل کا ہے، لیکن بہ قول مرتب۔ ''اس خط پر سنہ مرقوم نہیں۔ قرینے سے زمانہ متعین کیا گیا ہے۔'' ہمارے خیال کے مطابق یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے۔ جیسا کہ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے۔ یہی سیّد سلیمان ندوی کی بھی رائے ہے، 'حیاتِ شبلی' ص ۱۲۴ پر مرقوم ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ نگاری کی بہ نسبت سوانح نگاری سے زیادہ قریب ہیں۔

سرسیّد کی آثار الصنادید اگرچہ خالص علمی و تحقیقی تصنیف ہے اور دہلی و سلاطین دہلی کی تاریخ کے سلسلے میں اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ اپنی طرز کی کوئی انوکھی یا عہد آفریں کتاب نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں دہلی کی تاریخ کا کوئی سلسلہ وار بیان نہیں ملتا۔ اور دوسرے اس لیے کہ جس قسم کی تفصیلات اس کتاب میں درج کی گئی ہیں، اس طرح کی تفصیلات فارسی کی تقریباً سبھی تاریخوں میں درج کی جاتی تھیں۔ چنانچہ طبقات اکبری اس کی کھلی ہوئی مثال ہے[۱۳]۔ اس کے برخلاف شبلی کی تاریخی نگارشات موضوع و مواد اور ہیئت و اسلوب ہر دو لحاظ سے جدت و طرفگی کی حامل ہیں۔

شبلی نے تاریخ کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، بہ حیثیتِ مجموعی اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) تاریخِ خلافت

(۲) تاریخِ علوم و فنون

(۳) اسلامی یا مسلمانوں کی مدافعت میں تاریخی مقالات

''تاریخِ خلافت'' سے ہماری مراد خلفائے راشدین یا خلفائے مابعد میں سے کسی خاص خلیفہ کے عہد کی تاریخ ہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے دو کتابیں لکھی ہیں، اور دونوں ہی مشہور و معروف ہیں۔ المامون (۱۸۸۹ء) اور الفاروق (۱۸۹۸ء)۔

اوّل الذکر کا تعلق مشہور عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہدِ خلافت سے ہے اور ثانی الذکر کتاب خلیفۂ دوم حضرت عمرِ فاروقؓ کے دور سے متعلق ہے۔

یہ دونوں کتابیں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصے میں زیادہ تر ان ملکی واقعات سیاسی حالات اور جنگی فتوحات وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے، جو تاریخ کی قدیم کتابوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ البتہ ان کا دوسرا حصہ نہ صرف اُردو و فارسی بلکہ تمام مشرقی زبانوں کی قدیم تاریخوں سے یکسر مختلف ہے اور سچ پوچھیے تو یہیں مؤرخ شبلی کے جوہر کھلتے ہیں۔

۱۳۔ ضیاء الحسن فاروقی: سرسیّد احمد خاں مورخ کی حیثیت سے، اشخاص و افکار، ص ۳۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبلی نے ان دونوں کتابوں کے دوسرے حصے میں متعلقہ عہد کے تمدنی تہذیبی اور معاشرتی حالات نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے قلم بند کیے ہیں۔ اسی طرح ذہنی و علمی فضا کی تصویر کشی کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس چیز نے مؤرخ کی حیثیت سے انہیں اس بلند مقام تک پہنچا دیا ہے، جس میں ان کے معاصرین میں کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔

اس باب میں شبلی کی انفرادیت کا سبب، ان کا وہ رچا ہوا اور پختہ تاریخی شعور ہے، جو ان کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی شعور کی بنا پر انھوں نے مشرق میں تاریخ نگاری کی ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالی، جس سے کوئی واضح انحراف اب تک سامنے نہیں آسکا اور جس نے ان کے معاصرین میں بہتوں کو تاریخ نگاری کی جانب مائل کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شبلی نے اس باب میں گبن کی ''رومن ایمپائر'' سے بہت مدد لی ہے، بلکہ المامون اور الفاروق میں ایک حد تک اسی کا چربہ اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں کوئی دوسرا یہ کام کیوں نہ انجام دے سکا؟ اور گبن نے کسی دوسرے کی راہ نمائی کیوں نہ کر دی؟ مثلاً سرسیّد جو شبلی سے کم از کم دس سال پیشتر ''خطباتِ احمدیہ'' میں گبن کا حوالہ دے چکے تھے۔[۱۴] بلکہ اس کا اُردو ترجمہ چھ سو روپے کے صرف سے تیار کرا چکے تھے۔ اُنھوں نے اس باب میں کوئی پیش قدمی کیوں نہ کی؟

اس کا اصل سبب شبلی و سرسید کے ذہن و مزاج اور میلانِ طبع کا اختلاف ہے، جس کی بنا پر سرسیّد اس چیز کی طرف مائل نہ ہو سکے جو شبلی کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کر گئی۔ یہیں سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اخذ و اقتباس میں اصل اہمیت ماخذ کی نہیں بلکہ آخذ کی ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ شبلی نے جدید تاریخ نگاری کے سلسلے میں کن کن شخصیتوں یا تصانیف سے فیض اُٹھایا، بلکہ ہم اس پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ مغربی مؤرخین کی کِن کِن چیزوں نے اُنھیں اپنی جانب خاص طور سے متوجہ کیا، اور ان کے لیے جاذبِ نظر بنیں؟ یہاں تک شبلی نے انھیں اپنی فکر و نظر کا جزو بنا لیا۔

۱۴ سرسیّد احمد خاں: خطباتِ احمدیہ، لاہور، نول کشور اسٹیم پریس، ص ۴۳۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلے میں ہمیں زیادہ حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔ شبلی نے 'المامون' کے دیباچے میں خود ہی بتا دیا ہے کہ انھیں مغربی مؤرخین کی دو باتیں خاص طور پر پسند ہیں۔ ایک تو طرزِ معاشرت، طریقِ تمدن، سیاسی انتظامات اور علمی و ادبی صورتِ حال سے متعلق جزئیات کی فراہمی کا انداز۔ اور دوسرے واقعات کے اسباب وعلل کی تلاش اور انھیں ایک لڑی میں پرونے کی کوشش۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'المامون' ار 'الفاروق' میں ان دونوں امور کی پوری پوری رعایت کی ہے۔ اور یقیناً وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ خصوصاً الفاروق میں ان کی کامیابی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ یہاں تمدنی، معاشرتی اور انتظامی جزئیات کی فراہمی میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ البتہ ان دونوں کتابوں میں واقعات کے اسباب وعلل کی تعین کے سلسلے میں بعض مقامات پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی شبلی بہر حال کامیاب ہیں۔

ان خوبیوں کے علاوہ ان دونوں کتابوں کی زبان بھی نہایت سلیس شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ خصوصاً الفاروق کی بعض عبارتیں شبلی کے ادب اور انشاء کا شاہکار کہی جاسکتی ہیں۔

''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' (۱۸۸۷ء)، ''اسلامی کتب خانے'' (۱۸۹۲ء) اور ''اسلامی حکومتیں اور شفاخانے'' (۱۸۹۴ء) شبلی کے وہ مقالات ہیں جو اگرچہ براہِ راست ''تاریخِ خلافت'' کے ذیل میں نہیں آتے۔ لیکن ان کی تہ میں تاریخِ اسلام کے بعض ممتاز ادوار کی ذہنی و علمی فضا اور تمدنی جلوؤں کے بازیافت کی وہی روح کارفرما ہے، جو 'المامون' اور 'الفاروق' کا خاصہ ہے۔ مواد و مشتملات، زبان و بیان اور مصنف کی تحقیق و جستجو کے لحاظ سے مقالہ نگاری کی تاریخ میں انھیں سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔

''تاریخِ خلافت'' یا بہ الفاظِ دیگر ''تہذیبی وتمدنی تاریخ'' کے علاوہ شبلی نے بعض علوم وفنون کی بھی تاریخ لکھی ہے، اور جس طرح 'تہذیبی و تمدنی تاریخ نویسی' وہ ''مسبوق'' نہیں ''سابق'' ہیں۔ اسی طرح علوم وفنون کی تاریخ نویسی میں بھی انھیں شرفِ اوّلیت حاصل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبلی نے جن علوم وفنون کی تاریخ پر قلم اُٹھایا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) تاریخِ کلام

(۲) تاریخِ سیر ومغازی

(۳) تاریخِ شعرِ فارسی

علمِ کلام کی تاریخ پر شبلی کی کتاب ''علم الکلام'' (۱۹۰۲ء) محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے علمِ کلام کی تاریخ کے سلسلے میں جو کچھ اور جیسا کچھ لکھ دیا ہے، وہ اب تک اُردو زبان میں واحد ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد علمِ کلام کی حقیقت اس کے اہم مباحث، اس کی نشو ونما کے اسباب، عہد بہ عہد ارتقا اور مشہور متکلمین کے جستہ جستہ حالات و واقعات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

موضوع و مواد سے قطع نظر، دقیق اور فلسفیانہ مباحث کے لیے جیسی شگفتہ و سلیس زبان اس کتاب میں استعمال کی گئی ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ''علم الکلام'' کا مطالعہ اگر عبدالحلیم شرر کی تصنیف ''معتزلہ'' کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو مواد و مشتملات اور ہئیت و اسلوب ہر دو لحاظ سے شبلی کے تفوق و برتری کا راز سمجھ میں آ جائے گا۔

لیکن بہ حیثیت مؤرخ شبلی کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ کتاب کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے دماغ کے ساتھ نہیں لکھی۔ بلکہ ایک خاص جماعت کی حمایت و وکالت کو اپنا مطمعِ نظر بنا لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر اور گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ''علم الکلام'' کی تصنیف کا مقصد اصلی تاریخ نگاری نہیں، بلکہ شبلی نے اس کے ذریعے اپنے ان افکار و نظریات کی در پردہ حمایت اور پشت پناہی سے کام لیا ہے، جو اس کتاب کی دوسری جلد میں ''جدید علمِ کلام'' کے نام سے پیش کیے ہیں۔ اس صورتِ حال کی بنا پر ''علم الکلام'' میں کئی قسم کی خامیاں در آئی ہیں۔

سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بعض مخصوص افکار ونظریات اور ان کے علم برداروں کی حمایت کی بنا پر کتاب سے توازن و اعتدال کی وہ کیفیت رخصت ہو گئی ہے، جو تاریخ نگاری کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ متکلمین کی ایک جماعت (محدثین واشاعرہ) کی خوبیوں کو خامیوں کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے[۱۵] اور دوسری جماعت (معتزلہ) کی خامیوں پر پردہ ڈالنے اور انہیں خوبیوں کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دوسری خامی یہ ہے کہ ایک خاص فرقے کی تائید اور اس کی حمایت کو اپنا مطمع قرار دینے کی بنا پر شبلی اس کتاب میں محقق اور مؤرخ کے بجائے خطیب اور مناظر بن گئے ہیں۔ خطیب اپنی فطرت کے لحاظ سے عام طور پر تین چیزوں کا عادی ہوتا ہے۔ جذباتیت، مبالغہ آرائی اور اعادہ وتکرار۔ شاید تقریر میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے یہ چیزیں ضروری ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ تحقیق و تاریخ کے لیے یہ امور نہایت ضرررساں ہیں۔ بہرحال 'علم الکلام' ان عیوب سے خالی نہیں۔

اس کتاب کی تیسری خامی اس کا تجزیاتی اندازِ بیان ہے۔ تجزیاتی اندازِ بیان سے مراد یہ ہے کہ کسی واقعے یا مسئلے سے متعلق موافق اور مخالف تمام پہلوؤں کا مدلل اور مفصل جائزہ لیتے ہوئے کسی ایک پہلو کو ترجیح دی جائے۔ ظاہر ہے کہ 'علم الکلام' اس معیار پر کسی طرح پوری نہیں اُترتی۔ یہاں شبلی ہر موقع پر اپنا نظریہ پہلی ہی بار ظاہر کر دیتے ہیں اور پھر بار بار اس کا اعادہ کرتے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کو سوچنے سمجھنے اور خود فیصلہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہیں آتا۔

شبلی کی متذکرہ بالا خامیوں کا صحیح اندازہ اس وقت لگایا جاسکتا ہے جب کہ 'علم الکلام' کا مطالعہ مصر کے نامور ادیب اور مؤرخ ڈاکٹر احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کے اس حصے کو سامنے رکھ کر کیا جائے جو علمِ کلام کی تاریخ سے متعلق ہے[۱۶]۔

۱۵؎ مولانا نے محدثین واشاعرہ کی کونسی خوبیوں کو خامیوں کی شکل میں پیش کیا؟ مقالہ نگار نے کوئی ایک مثال پیش نہیں کی۔ (ایڈیٹر)

۱۶؎ مرحوم احمد امین نے مسلمانوں کے فکری زوال کا رشتہ معتزلہ کی شکست سے جوڑا ہے۔ اگر شبلی معتزلہ کی فکری کاوشوں کے مداح ہیں، تو یہ بات شبلی کے حق میں جاتی ہے، نہ کہ ان کے خلاف، جیسا کہ فاضل مقالہ نگار کہنا چاہتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''تاریخ علوم وفنون'' کے ذیل میں شبلی کا دوسرا کارنامہ ''مقدمہ سیرۃ النبی'' (۱۹۱۴ء) ہے۔ یہ مقدمہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ فنِ سیرت و مغازی کی تاریخ اور اسلامی اصولِ روایت۔ جہاں تک اوّل الذکر حصے کا تعلق ہے، شبلی نے اس میں سیرت و مغازی کے آغاز عہد بہ عہد ارتقا اور خصوصاً اس فن کے اوّلین مصنّفین و تصانیف کے بارے میں جو مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال نہ صرف اُردو بلکہ عربی زبان میں بھی مشکل سے ملے گی۔ چنانچہ اس کی تصنیف پر آج ستر سال گزر جانے کے باوجود، اس سے اخذ و استفادے کا سلسلہ بہ دستور جاری ہے۔

یہاں ڈاکٹر تقی الدین ندوی کے اس عربی مقالے کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جو اُنھوں نے، دوحہ (قطر) کی تیسری عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ ماہ نومبر ۱۹۷۹ء میں پڑھا تھا اور جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر نعیم صدیقی کے قلم سے جون ۱۹۸۱ء کے ماہ نامہ 'معارف' اعظم گڑھ میں شائع ہو چکا ہے۔ موصوف کا یہ مقالہ اگرچہ بعض جدید اور مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کا وہ حصہ جو سیرت و مغازی کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ نہ صرف یہ کہ شبلی کے ''مقدمۂ سیرت'' سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ بلکہ اس کے بہت سے مباحث غیر معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ جوں کے توں قبول کر لیے گئے ہیں۔ اس سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فنِ سیرت نگاری کی تاریخ سے متعلق شبلی کے فراہم کردہ مواد کی تازگی، طرفگی آج بھی برقرار رہے اور اس پر اضافہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ 'مقدمۂ سیرت' کے زیرِ بحث حصے میں تاریخ نگاری کے نقطۂ نظر سے دو زبردست خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شبلی نے تصانیفِ سیرت کے بارے میں بہ حیثیت مجموعی یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان میں صحت و صداقت کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ مصنّفین سیرت نے رطب و یابس جو کچھ پایا ہے۔ سب بلا کم و کاست جمع کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے 'سیرت' کے اکثر راویوں اور مصنفوں کو مجروح و ضعیف اور واقدی کو کذاب و وضّاع بتا کر ان کے اصل مرتبے سے فروتر ثابت کرنے کی کوشش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ہے۔

حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مصنّفینِ سیرت نے بھی حتیٰ الامکان صحت وصداقت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اپنی دانست کے مطابق صحیح روایات کے جمع و انتخاب میں کسی قسم کی فروگزاشت روا نہیں رکھی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ سے متعلق حالات و واقعات کا مقابلہ صحت و صداقت اور اصول و روایت و درایت کے لحاظ سے، دُنیا کے کسی دوسرے شخص سے متعلق حالات و واقعات سے کیا جائے، تو اوّل الذکر کو ثانی الذکر پر بہر حال ترجیح حاصل ہوگی۔ بلکہ اوّل الذکر سے متعلق صحیح ترین جزئیات وتفصیلات جس کثرت کے ساتھ مل جائیں گی۔ ثانی الذکر سے متعلق اس کا عشرِ عشیر بھی دستیاب نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کے پسِ پشت مصنّفینِ سیرت کی تحقیق و تدقیق، تلاش وجستجو اور محنت و جاں فشانی پوری طرح کارفرما ہے۔ ورنہ واقعاتِ سیرت کا معاملہ، عام لوگوں کے حالاتِ زندگی سے مختلف نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ''خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا''[۱۷]

شبلی نے اپنے موقف کے اثبات کے لیے تصنیفِ سیرت کا مقابلہ ''کتبِ حدیث'' سے کیا ہے۔ یہ بات بہ ذاتِ خود غلط نہیں ہے۔ لیکن اُنھیں چاہیے تھا کہ وہ دوسری طرف سے ان کا موازنہ تاریخ، تراجم، اور طبقات کی کتابوں سے بھی کرتے تاکہ موازنہ و مقابلہ کا حق ادا ہوتا اور تصانیفِ سیرت کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملتی۔ بہ صورتِ موجودہ ان کا طریقِ کار جانب دارانہ اور غیر منصفانہ ہے۔ لہٰذا ان کے نتائج سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مصنف ''اصح السیر'' نے بھی اس سلسلے میں شبلی کی اچھی گرفت کی ہے[۱۸]۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سیرت کے اکثر راویوں اور مصنفوں کو شبلی نے ان کی اصل

۱۷۔ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، حصہ اوّل، طبع دہم، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۷۵ء، ص ۸-۹۔
۱۸۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری: اصح السیر، دیوبند، کتب خانہ رحیمیہ، سنہ ندارد، ص ۸-۱۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت سے گھٹا کر پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں واقدی کے علاوہ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الدوسی ابومعشر نجیح المدنی۔ زیاد بن عبداللہ البکائی اور سلمہ بن الفضل الابرش وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

ان میں سے واقدی کے بارے میں شبلی نے لکھا ہے:

"محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے۔"[19]

یہاں شبلی نے محدثین کے جس اتفاق کا ذکر کیا ہے۔ اس کی حقیقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین کی جماعت کے کم از کم ایک درجن افراد ایسے ہیں، جنھوں نے اس کو 'ثقہ' اور قابلِ استناد قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کی "تہذیب التہذیب" ملاحظہ ہو[20]۔ یہی حال ابومعشر نجیح المدنی اور زیادہ بن عبداللہ البکائی وغیرہ کا ہے۔ شبلی نے اُنھیں محدثین کی بارگاہ میں غیر مقبول بتایا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے نزدیک 'ثقہ' اور 'حجت' ہیں[21]۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس بحث کے آخر میں متذکرہ بالا دونوں خامیوں کے اصل سبب کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔ ہمارے نزدیک شبلی کی ان کوتاہیوں کا تعلق ان کے متکلمانہ اندازِ سیرت نگاری سے ہے۔ اس کی توضیح اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ "سیرۃ النبی" کی تصنیف سے شبلی کا اصل مقصد واقعاتِ سیرت سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دینا اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اعتراضات کے صحیح جواب تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے ہر وہ قابلِ اعتراض واقعہ جس کے جواب تک ان کے ذہن کی رسائی نہ ہو سکی، اس کے بارے میں اُنھوں نے کہہ دیا کہ واقعہ صحیح روایات کے ذریعے ثابت نہیں۔

لیکن چونکہ ان کے اس قسم کے جواب کی سطحیت ہر شخص پر بہ آسانی ظاہر ہو سکتی تھی۔

---

۱۹ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، حصہ اول، ص ۴۸۔

۲۰ حافظ ابنِ حجر عسقلانی: تہذیب التہذیب، ج نہم، طبع اوّل، حیدرآباد دکن، دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۲۶ھ، ص ۳۶۳-۳۶۸۔

۲۱ ایضاً، جلد دہم، ۱۳۲۷ھ، ص ۴۲۲ (بہ سلسلہ ابومعشر نجیح المدنی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے اُنھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ مقدمۂ کتاب میں ''سیرت و مغازی'' کی تاریخ لکھ کر ابتدا ہی میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ تصانیف سیرت کو اعتبار و استناد کا درجہ حاصل نہیں۔ لہٰذا سیرت کے وہ تمام واقعات جن پر مستشرقین کی جانب سے اعتراضات کیے گئے ہیں، دراصل ان کی صحت ہی مشکوک ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا حقیقت حال کچھ اور ہے۔

تاریخِ علوم وفنون کے ضمن میں شبلی کا تیسرا اہم کارنامہ ''شعر العجم'' ہے۔ اس کی شروع کی تین جلدیں (بہ لحاظ اغلب) تاریخ کے ذیل میں آتی ہیں اور آخر کی دو جلدوں کا تعلق تنقید سے ہے۔ شعر العجم جس زمانے اور جن حالات میں لکھی گئی اور اس کے بعد سے ہند و بیرون ہند کے ادبی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی۔ اس کے پیشِ نظر پروفیسر نذیر احمد کا یہ خیال کچھ غلط نہیں کہ:

''اس کتاب کو جس قدر مقبولیت ہوئی اور مولانا شبلی کو جو شہرت حاصل ہوئی، اس کا اندازہ شاید مولانا کو بھی نہ رہا ہوگا۔ اس کے پہلے دو تین حصوں کی تصنیف کو تقریباً ستر سال ہوئے۔ اس درمیان میں فارسی کا وافر مواد جمع ہوا جو مولانا کے دست رس میں نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اب تک کوئی کتاب ان موضوعات پر جس کا احاطہ شعر العجم نے کیا ہے۔ شعر العجم جیسی وجود میں نہیں آ سکی ہے۔ مولانا شبلی کی یہ تصنیف ہنوز نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، اور باجود وسائل کی کمی کے ایسی کتاب مرتب ہوئی، جو ستر برس سے تاریخِ شعر و ادب فارسی کے خطے کی تنہا حکمراں ہے۔[۲۲]''

ان تمام خوبیوں کے باوجود جن کا متذکرہ بالا سطور میں کیا گیا۔ جہاں تک 'شعر العجم' کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، یہ کتاب چنداں بلند پایہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے 'تنقید شعر العجم' میں خصوصیت کے ساتھ اس کے تاریخی بیانات کا نہایت مفصل اور محققانہ جائزہ لیا ہے۔ جس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے بیانات کی تاریخی حیثیت مشتبہ اور مشکوک ہے۔ ان کے یہاں واقعات کی تحقیق و تنقیح کا کوئی بلند معیار قائم نہیں رکھا گیا ہے۔

---

۲۲ پروفیسر نذیر احمد: مولانا شبلی اور ان کی فارسی خدمات، معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ کے سلسلے میں واقعات کی تحقیق کا کوئی واضح تصور شبلی کے پیشِ نظر نہ تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ادب کی تاریخ میں اسماء و اشخاص، سنین اور زمانے نیز واقعات و حالات کی تعیین و تفصیل میں اگر کوئی غلطی واقع ہو جائے تو یہ بہت زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ البتہ جہاں تک تاریخِ اسلام کا تعلق ہے تو یہاں اغلاط کا راہ پا جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ واقعے کی تحقیق کا کوئی واضح تصور شبلی کے پیشِ نظر نہ تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ادب کی تاریخ میں اسماء و اشخاص، سنین اور زمانے نیز واقعات و حالات کی تعیین و تفصیل میں اگر کوئی غلطی واقع ہو جائے تو یہ بہت زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ البتہ جہاں تک تاریخِ اسلام کا تعلق ہے تو یہاں اغلاط کا راہ پا جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ واقعے اور اس کے متعلقات کے ذریعے اسلام اور مسلمان سے متعلق ذم کا کوئی پہلو برآمد ہوتا ہو۔ چنانچہ انھوں نے ادبی تاریخ کے موضوع پر جہاں کہیں قلم اُٹھایا ہے، عموماً سطحی اور سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔

شعر العجم کے علاوہ اس سلسلے کی ایک دوسری مثال، موازنہ انیس و دبیر میں 'مرثیہ نگاری کی تاریخ' بھی ہے۔ نوبت رائے نظر، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر مسیح الزماں وغیرہ کا یہ تاثر غلط نہیں کہ مرثیہ نگاری کی تاریخ بیان کرتے ہوئے، شبلی نے مورخانہ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے، اور مرثیہ نگاری کی روایت کی بہت سی کڑیاں محض اپنی عجلت پسندی اور سہل انگاری کی بدولت چھوڑ دی ہیں۔ نوبت رائے نظر لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں کوئی مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھتے ہوئے، اُنھوں نے عربی و فارسی مرثیوں کے اس فن کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ عربی و فارسی کے بعد آپ نے اُردو مرثیہ گوئی پر بھی تاریخی نظر ڈالی ہے۔ لیکن اس بارے میں مصنف 'آبِ حیات' کا تتبع کافی سمجھا گیا ہے[۲۳]۔''

اسی طرح پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

''مولانا شبلی کا ذوق تاریخی اور تحقیقی تھا... موازنہ کا مطالعہ اگر اس نظر سے کیا جائے،

---

۲۳ نوبت رائے نظر (نقاد لکھنوی): موازنہ انیس و دبیر، زمانہ، کانپور، مئی ۱۹۰۸ء، ص ۳۳۶-۳۴۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اس کا پایہ کچھ زیادہ بلند نظر نہیں آتا... اگر عربی اور فارسی مرثیہ گوئی کی تاریخ مختصر ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انھیں ان کا ذکر ضمنی حیثیت سے کرنا تھا... لیکن اُردو مرثیے کی تاریخ بھی سرسری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک دکن کی مرثیہ گوئی کے متعلق معلومات بہت کم تھیں۔ لیکن شمالی ہند کے متعلق بھی کاوش سے کام نہیں لیا گیا۔[۲۴]

شبلی کی تاریخی نگارشات کی تیسری قسم وہ ہے، جس کے لیے ہم نے ''اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں تاریخی مقالات'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ شبلی نے جن تحریروں کے ذریعے غیر معمولی اور غیر فانی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان میں زیرِ بحث تاریخی مقالات سرفہرست ہیں۔ اس سلسلے میں اہم اور قابلِ ذکر مقالات کے نام یہ ہیں:

(۱) کتب خانہ اسکندریہ (۱۸۹۲ء)

(۲) الجزیہ (۱۸۹۴ء)

(۳) حقوق الذمیین (۱۸۹۶ء)

(۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر (۱۹۰۶ء)

(۵) الانتقاد علی التمدن الاسلامی (۱۹۱۲ء)

واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی فلسفیانہ موشگافیاں اور مورخانہ نکتہ آفرینیاں، ان مقامات میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی ہیں۔ اور مشہور عرب مورخ و ادیب جرجی زیدان، نامور انگریز پادری جان ملکم اور معروف پارسی مصنف جے۔ کے زیمان وغیرہ نے شبلی کے فضل و کمال کا اعتراف انھیں مقامات کی بنیاد پر کیا ہے۔

جان ملکم نے شبلی کی حیات میں ہی ان پر ایک مضمون ماہ نامہ ادیب، الٰہ آباد میں ''علامہ شبلی نعمانی'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

''علماء و مصنّفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے۔ اوّل مادۂ تحقیق و تدقیق، دوم جانچ پڑتال، سوم جدت، چہارم مضبوطی راے و استدلال، علماء و مصنّفین ہند

---

[۲۴] پروفیسر احتشام حسین، موازنہ انیس و دبیر، ادیب، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا متخیلّہ تو بے شک زیادہ قوی ہے، لیکن ان میں مبالغے کی عادت ہے۔

ان کے تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ و متضاد خیالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بہ خلاف اس کے اہلِ مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور درست الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اہلِ مغرب کے محققانہ و عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ویسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں، تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔[۲۵]''

اس طرح جے۔ کے نریمان پارسی حمزہ اصفہانی کی تاریخی ''سنی ملوک الارض'' پر اپنے محققانہ ریویو میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''ہمارے نزدیک یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ کتاب الفہرست کے متعلق شمس العلما شبلی نعمانی کی کوششوں کو نظرانداز کردیں۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے۔ یہ پہلا ہندوستانی عالم ہے، جس نے اس کتاب کی حقیقی قدر و قیمت کو پہچانا اور بیش بہا دل چسپ مضامین کا ایک سلسلہ قدیم لٹریچر پر، جس سے عربوں نے فائدہ اُٹھایا اور جس کے متعلق ''الفہرست'' میں بے شمار اشارے پائے جاتے ہیں، لکھا... ہمارے خیال میں پارسیوں کے لیے زیادہ مفید ہوگا، اگر وہ پروفیسر براؤن کی تصانیف ''رسائلِ شبلی'' کے ساتھ ساتھ پڑھیں۔ جو قبل اس کے کہ یورپ کتاب الفہرست کی باقاعدہ تحقیقات کی طرف متوجہ ہو، شائع ہو چکے تھے۔ شبلی کی تحقیقات مغربی تحقیقات سے بالکل جداگانہ ہیں۔[۲۶]''

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بالغ نظر مورخ و محقق کی حیثیت سے شبلی کس قدر احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں ان کے بعض ان اصولوں پر بحث کرنا چاہتے ہیں، جنھیں موصوف نے اپنے تمام تاریخی مقالات و تصانیف میں عموماً اور ''دفاعی تاریخی مقالات'' میں خصوصاً نہایت چابک دستی اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور جس کی روشنی میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، آفتاب احمد صدیقی، ضیاء الحسن فاروقی، اور اختر وقار عظیم

۲۵؎ جان ملکم پادری، علامہ شبلی نعمانی، ادیب، الہ آباد، جولائی ۱۹۱۱ء، ص ۱۴-۱۷۔

۲۶؎ جے۔ کے نریمان پارسی، ریویو ''سنی ملوک الارض''، مترجمہ، مرزا احسان احمد بیگ، معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۱۶ء، ص ۵۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ نے ''شبلی کے نظریۂ تاریخ'' مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

محولہ بالا اصولوں سے متعلق گفتگو کو ہم دو وجھوں سے اور بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ ہمارے خیال کے مطابق ان اصولوں کو اب تک صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ان پر بحث کیے بغیر شبلی کی مورخانہ حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

شبلی کے نزدیک واقعات جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ ایک روایت اور دوسرے درایت۔ روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کے ذریعے بیان کیا جائے جو خود اس واقعہ میں موجود تھا اور اس سے لے کر اخیر راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تمام راویوں کی نسبت یہ بھی تحقیق کر لی جائے کہ وہ راست گو اور بات کو اچھی طرح سمجھنے اور یاد کرنے والے تھے یا نہیں؟''[۲۷]

اسی طرح درایت سے مراد یہ ہے کہ عقلی معیاروں کی رو سے واقعاتِ صحت کا اطمینان کر لیا جائے۔ مثلاً:

(۱) یہ دیکھ لیا جائے کہ جس واقعے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ اصول عادت اور قواعد تمدن کی رُو سے ہو سکتا ہے یا نہیں!

(۲) جس زمانے کا واقعہ ذکر کیا جا رہا ہے، اس زمانے کے لوگوں کا میلان عام واقعے کے مخالف تھا یا موافق؟

(۳) اس امر کی تفتیش کر لی جائے کہ راوی جس چیز کو واقعہ بنا کر بیان کرتا ہے، اس میں خود راوی کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

(۴) راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے، کیا وہ واقعے کی پوری تصویر ہے یا اس کا احتمال ہے کہ واقعے کی بعض خصوصیتیں اس کی نظر میں نہ آ سکی ہوں۔

(۵) اس بات کا بھی اندازہ لگایا جائے کہ وقت کے گزرنے اور راویوں کے اندازِ بیان

---

۲۷ شبلی نعمانی: الفاروق، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اختلاف نے واقعے میں کیا کیا اور کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں؟[۲۸]

شبلی کے ان اصول روایت و درایت کی عام طور پر مبالغہ آمیز انداز میں تعریف کی جاتی ہے۔ مثلاً اختر وقار عظیم لکھتے ہیں:

"شبلی کو اُردو کا پہلا فلسفی مورخ کہا گیا ہے اور یہ بات ہے بھی سچ۔ وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اُردو میں اوّل اوّل با قاعدہ تاریخ نویسی کے اصول اور قاعدے مرتب کیے اور اُنھیں عملی طور پر اپنی تصانیف میں برتا بھی۔"[۲۹]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے بیان کردہ اصولوں کو تاریخ نویسی کے نظری و عملی اصول قرار دینا ایک بہت بڑی بھول اور سخت غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تاریخوں میں ان اصولوں کو کہیں بھی نہیں برتا۔ یہ اصول دراصل ان کے ترکش کے وہ تیر ہیں جنھیں وہ تاریخی مباحث میں اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین کی جانب باری باری چلاتے ہیں اور بالآخر کوئی نہ کوئی تیر نشانے پر بیٹھ ہی جاتا ہے۔

اس اجمال کی توضیح یہ ہے کہ وہ پہلے تو فریقِ مخالف سے واقعے کی سند طلب کرتے ہیں۔ مخالف جب سند پیش کر دیتا ہے تو اس پر نقد و جرح شروع کرتے ہیں اور چونکہ راویوں کے بارے میں عموماً جرح و تضعیف کا کوئی نہ کوئی قول مل ہی جاتا ہے۔ اس لیے وہ حریف کو پہلے ہی مرحلے میں شکست دے کر اعلانِ فتح کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر روایت کی سند مضبوط ہے اور اس پر کسی پہلو سے جرح کا امکان نہیں رہ جاتا تو وہ درایت کے تیروں کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی یہ کہتے ہیں کہ واقعہ اصولِ عادت اور قواعد تمدن کی رُو سے ممکن ہی نہیں۔ کبھی واقعے کے قبول میں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ واقعہ قواعدِ تمدن کے خلاف نہیں، لیکن جس زمانے کا ہے، اس زمانے میں لوگوں کے میلانات واقعے کے مخالف تھے، لہٰذا اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کہہ رہا ہے وہ اس کا اپنا قیاس

۲۸۔ شبلی نعمانی: الفاروق، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۶ء، ص ۱۴-۱۵۔

۲۹۔ اختر وقار عظیم: شبلی بہ حیثیت مورخ، ص ۶۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو۔ کبھی یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ واقعہ بہ ذاتِ خود صحیح ہے۔ لیکن اس سے متعلق بعض اہم اور ضروری جزئیات راوی نے بیان نہیں کیں۔ ظاہر ہے کہ ان حربوں کے سامنے فریقِ مخالف زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔ اس لیے میدان بالآخر شبلی کے ہاتھ رہتا ہے۔

اگر شبلی کے متذکرہ بالا تاریخی مقالات کا جائزہ ہمارے اس بیان کی روشنی میں لیا جائے، تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ان کی تمام فلسفیانہ موشگافیاں اور مورخانہ نکتہ سنجیاں انھیں اصولوں پر قائم ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اصولوں کے معیار پر دُنیا کا کوئی عظیم الشان سے عظیم الشان واقعہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ کسی بھی واقعے کے سلسلے میں احتمالات پیدا کیے جا سکتے ہیں اور بالآخر اسے پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان اصولوں کے علاوہ شبلی نے ایک اصول یہ بھی وضع کیا ہے کہ کسی بھی واقعے سے متعلق روایت و درایت کے اصولوں کا استعمال اسی موقع پر کیا جائے گا، جب کہ واقعہ اہم ہو۔ ورنہ عام روایات و واقعات کے سلسلے میں اس قسم کی تدقیق و تحقیق کی ضرورت نہیں۔[30]

اب ظاہر ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین کی جانب سے جب بھی کوئی واقعہ اعتراض و الزام کی نیت سے نقل کیا جائے گا، تو وہ اہم اور غیر معمولی بن جائے گا۔ اور اس پر روایت و درایت کے سارے اصول نافذ کر دیئے جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر واقعے کے ناقل و راوی شبلی اور ان جیسے دوسرے مسلمانوں کے ہم درد مصنف و مورخ ہوں گے، تو نہ تو واقعے کو اہم اور غیر معمولی قرار دیا جائے گا اور نہ اسے روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوئی ضرورت ہوگی۔

یہ بات یوں ہی نہیں کہی جا رہی ہے۔ سیرۃ النبی جیسی محققانہ تصنیف میں شبلی نے متعلق مقامات پر بخاری و مسلم کی روایتوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعے کے اثبات کے لیے یہ روایت کافی نہیں۔[31] محض اس لیے کہ اس پر مستشرقین کی جانب سے کوئی

---

۳۰ شبلی نعمانی، الفاروق، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۶ء، ص ۱۴۔

۳۱ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ امام ابوبکر جصاص نے اپنی معروف کتاب 'احکام القرآن' میں (ج ا،

[بقیہ اگلے صفحے پر...]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتراض وارد ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف اسی ''سیرۃ النبی'' میں بعض کمزور روایات بھی بلاتحقیق و تفتیش داخل کر لی گئی ہیں۔ کیونکہ وہ مستشرقین کی جانب سے قابلِ اعتراض نہ تھیں۔

اس لیے ہمارے نزدیک شبلی کے تاریخی مقالات و تصانیف کے وہ حصے جن میں انھوں نے اسلام یا مسلمانوں کے دفاع کے لیے متذکرہ بالا اصولوں کا استعمال کیا ہے۔ پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں[۳۲]۔ بلکہ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر انھوں نے ان اصولوں کو نہ اپنایا ہوتا، تو بہ حیثیت مورخ ان کا پایۂ کہیں زیادہ بلند ہوتا۔

[...بقیہ] سورۃ بقرہ: ۱۰۲) صحیح بخاری کی حدیث جو آنحضرت ﷺ پر جادو کے اثر سے تعلق رکھتی ہے، یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ اس قسم کی روایتیں ملحدین نے گھڑی ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شبلی پر فاضل مقالہ نگار کی تنقید بالکل بے بنیاد ہے۔ حضرت احمد بن حنبل کا معروف قول ہے کہ تفسیر، ملاحم (خون ریز جنگیں) اور مغازی کی کوئی بنیاد نہیں۔ (ثلاثۃ لیس لھا اصل التفسیر، الملاحم والمغازی) (ایڈیٹر)

۳۲؎ اتنے بڑے دعوی کی حمایت میں دلائل کا ذکر ضروری ہے۔ (ایڈیٹر)

© rasailojaraid.com